THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

اسلم جیراج پوری کے نظریہ حدیث کا تحقیقی مطالعہ

"A Critical Research Study on the Hadith Theory of Aslam Jairajpuri"

MUHAMMAD AMMAD UL RASOOL
MPhil Scholar, Sheikh Zayed Islamic Centre, University of the Punjab, Lahore
ammadrasool375@gmail.com
MUHAMMAD MUNEEB ALI SHAH KHAN
MPhil Scholar, Sheikh Zayed Islamic Centre, University of the Punjab, Lahore
mk4664538@gmail.com

ABSTRACT

This article presents a critical and analytical study of the Hadith theory of Aslam Jairajpuri. It begins with a brief introduction to his life, including his birth, family background, and educational journey, highlighting the intellectual environment that shaped his thought. The study then systematically examines his views on Hadith, focusing particularly on the objections he raised regarding the authority and authenticity of Prophetic traditions. These objections are presented and analyzed directly from his original works to ensure accuracy and authenticity. The article aims to provide a clear understanding of his methodological approach and interpretive framework concerning Hadith. Furthermore, it evaluates his arguments in light of the established principles of Hadith scholarship and mainstream Islamic thought. The research concludes by assessing the impact and significance of his ideas within the broader discourse on the authority of Hadith in the Subcontinent.

Keywords: Aslam Jairajpuri, Hadith Studies, Hadith Authority, Hadith Criticism, Quranist Thought, Subcontinent Islamic Thought, Islamic Scholarship

برصغیر میں فتنۂ انکارِ حدیث ایک فکری و دینی انحراف کے طور پر اُس وقت نمایاں ہوا، جب بعض اہلِ فکر نے مغربی عقل پرستی، استعماری اثرات اور جدیدیت کے زیرِ اثر سنتِ نبوی ﷺ کی حجیت کو چیلنج کرنا شروع کیا، اس رجحان کی بنیاد اگرچہ ابتدائی طور پر بعض قدیم منکرین کے ہاں بھی ملتی ہے، تاہم برصغیر میں اس نے باقاعدہ تحریک کی صورت عبد اللہ چکڑالوی کے ذریعے اختیار کی، جنہوں نے "اہلِ قرآن" کے نام سے حدیث کی حجیت کا انکار کیا، بعد ازاں غلام احمد پرویز نے اپنے مخصوص نظریات کے ساتھ اس فکر کو مزید فروغ دیا، جبکہ اسلم جیراج پوری نے بھی حدیث کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہوئے ایک الگ زاویۂ نظر پیش کیا۔ اس فتنے کے اسباب میں نصوصِ شرعیہ کی غلط تعبیر، عقل کو وحی پر مقدم کرنا، اور مغربی مستشرقین کے اعتراضات سے مرعوبیت شامل ہیں، جس کے نتیجے میں امتِ مسلمہ کے متفقہ ماخذِ شریعت یعنی قرآن و سنت کے باہمی تعلق کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس تحقیق میں اسلم جیراج پوری کے نظریہ حدیث کا تحقیقی مطالعہ پیش کیا جائے گا۔

پیدائش:

محمد اسلم بن علامہ سلامت اللہ بھوپالی کی پیدائش ۲۷ جنوری ۱۸۸۰ء یا ۱۸۸۰ء کو ہندوستان میں اعظم گڑھ کے قریب ایک قصبہ جراج پور میں ہوئی، آپ کا گھر اہل حدیث تحریک کا گہوارہ تھا۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے والد اس وقت حج بیت اللہ کرنے گئے ہوئے تھے، آپ کے والد ایک مشہور عالم دین اور فلسفہ کے مورخ تھے۔

تعلیم و تعلم:

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

اسلم جیراجپوری کو پانچ برس کی عمر میں مدرسے میں داخل کرایا گیا جہاں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ نو(۹) سال کی عمر میں حفظ قرآن مکمل کیا، قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد انہوں نے عربی، فارسی، انگریزی اور فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی، انہوں نے قرآن کی تفسیر خود اپنے والد سے پڑھی۔ اس کے بعد انہوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق تیر اندازی اور فن حرب کی تربیت بھی لی۔ یہ ایک مشہور حقیقت ہے کہ اسلم جراجپوری نے کسی رجسٹرڈ اور منتظم دینی مدرسہ سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ اور نہ ہی کسی یونیورسٹی میں اُن کی رجسٹریشن ہوئی لیکن انہیں علم اور مطالعہ کرنے کا شدید شوق تھا جس کی وجہ سے انہیں یہ شہرت ملی۔[1]

تعلیم و مطالعات کی تکمیل کے بعد ۱۹۰۳ء میں اسلم جراجپوری نے لاہور سے شائع ہونے والے ایک روزنامہ "پیسہ اخبار" میں کاتب مقرر ہوئے۔ اور یہیں سے برصغیر میں ان کو شہرت ملی۔ لیکن ۱۹۰۶ء میں یہ کتابت چھوڑ دی۔ اور علی گڑھ کے ایک ثانوی مدرسہ میں عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ چھ سال بعد ۱۹۱۲ء میں اسی ثانوی مدرسہ میں لٹن لائبریری کے انچارج مقرر ہوئے۔ بعد ازاں وہی پر عربی اور فارسی کے لیکچرر مقرر ہوئے لیکن اس تقرری کے بعد وہ زیادہ وقت تک وہاں نہیں ٹھہرے اور اسی دوران وہ تحریک ترک موالات سے متاثر ہوئے اور مولانا محمد علی مرحوم نے انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ بلوالیا جہاں یہ تاریخ اسلام کے استاد مقرر ہوئے۔

تصانیف:

اسلم جراج پوری نے اپنی زندگی میں قرآن اور حدیث کا از خود گہرا مطالعہ کیا، قرآن اور حدیث پر اپنا الگ موٴقف تھے جس کا اظہار انہوں نے اپنی تصانیف میں کیا، جس کی وجہ سے وہ شدید تنقید کا نشانہ بنے۔ اسلم جراجپوری نے کثیر کتب اور مقالات تحریر کیے، چند ایک یہ ہیں:

(1) تاریخ القرآن	(2) تعلیمات قرآن	(3) نکات قرآن
(4) علم حدیث	(5) تاریخ نجد	(6) تاریخ الامہ
(7) محجوب الارث	(8) الوارثیہ فی الاسلام	(9) خواتین
(10) مقالات اسلم	(11) عقائد اسلام	(12) ارکان اسلام
(13) جواہر ملیہ	(14) حیات حافظ	(15) قواعد السلمیہ[2]

انکار حدیث کا سبب اور منکرین حدیث سے تعلق:

جب اسلم جیراجپوری کے والد کی وفات ہوئی، تو انھوں نے اپنے چچا سے دادا کی وراثت میں حصہ طلب کیا، تو چچا نے حصہ دینے سے منع کر دیا کیونکہ شرعی طور پر ان کا وراثت میں حصہ بنتا ہی نہیں تھا، خود اسلم جراجپوری لکھتے ہیں: "سراجی کے سبق کے دوران میں پوتے کی وراثت میں محرومی کے مسئلے پر ٹھہر گیا، میرے دل نے اس چیز کو قبول نہیں کیا۔ میں نے علم میراث کی کتابوں میں اس مسٔلہ کو تلاش کیا، لیکن میں نے اپنی موافقت نہیں پائی۔ اور آخر میں میں نے قرآن مجید میں اس کی موافقت پائی۔"[3] جہاں تک خواجہ احمد دین کے افکار و خیالات سے متاثر ہونے کا تعلق ہے۔ تو یہ خواجہ صاحب کی کتاب سے واضح ہوتا ہے۔ اس کا نام "وراثت فی الاسلام" رکھا۔ اسی طرح اسلم جیراجپوری نے میراث کے مسٔلہ میں خواجہ صاحب کا نظریہ اپنایا۔ انھوں نے اس کتاب میں میراث کے اس مسئلے کے قواعد اور اصولوں پر تنقید کی، جن پر تمام مسلمانوں کا اجماع تھا۔[4]

[1] حافظ صلاح الدین، تاریخ وعقائد منکرین حدیث، علوم اسلامیہ عربی گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان، ۱۹۹۶، ص:۲۶

[2] ابو سفیان اصلاحی، ڈاکٹر، مولانا اسلم جیراج پوری حیات وخدمات، شعبہ عربی اے ایم یو، علی گڑھ، ۲۰۰۱، ص:۱۳۰

[3] اسلم جیراج پوری، مقالات اسلم، امداد صابری چوڑیوالاں، دہلی، س:ن، ص:۱۸-۱۹

[4] حافظ صلاح الدین، تاریخ وعقائد منکرین حدیث، ص:۲۷

محققین علماء کرام کی آراء کے مطابق عبد اللہ چکڑالوی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے برصغیر میں کھل کر حدیث کا انکار کیا اور فرقہ "اہل قرآن" کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کے بعد مولوی احمد الدین امر تسری نے انکار حدیث کے فتنے کا بیڑا اٹھایا۔ اور اسلم جیر اج پوری نے اس نظریہ کو مزید آگے بڑھایا۔ آخر میں غلام احمد پرویز نے انکار حدیث کو ایک منظم نظریہ اور مکتب فکر کی صورت میں پیش کیا۔[5]

وجہ شہرت:

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اسلم جیر اجپوری کو "اہل قرآن" میں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حدیث، فقہ، تفسیر، میراث میں مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی اکثر تصنیفات حدیث کے بارے میں ہیں۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تو وہ آسان اور پر کشش ہے اور اس بات کو ان کے مخالفین نے بھی تسلیم کیا ہے اور اسی وجہ سے اسلم جیر اجپوری کو تاریخ اسلام میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اور اسی کتاب کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کو "علامہ "کالقب دینے کا ارادہ کیا۔ مختصر یہ کہ تصنیفات میں پرویز کے بعد دوسرا نمبر اسلم جیر اجپوری کا ہے۔ اور اہل قرآن کے افکار وخیالات کو پھیلانے میں بھی پرویز کے بعد اسلم جیر اجپوری سر فہرست ہیں۔[6]

وفات:

۱۹۴۸ء میں قیام پاکستان کے بعد دیگر مہاجرین کی طرح اسلم جراجپوری بھی پاکستان چلے آئے لیکن تھوڑی مدت کے بعد دوبارہ ہندوستان واپس چلے گئے۔ مارچ ۱۹۵۵ میں وہ بیمار ہو گئے اور آہستہ آہستہ مرض بڑھتا گیا۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء کو ۷۵ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔[7]

اسلم جیراج پوری کا نظریہ حدیث:

- حدیث کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکی تاریخی ہے۔
- احادیث پر علمی طور پر جو تنقید کی گئی ہے اس نے حدیث کے تدین کو ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ امور دینیہ تنقید اور لوگوں کی آرار سے مبرا ہوتے ہیں۔
- حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے بلکہ اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔
- عہد رسالت اور عہد صحابہ میں احادیث بہت کم بیان ہوئیں، اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے ناموں سے جو بے شمار وایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانہ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہے۔
- حدیثیں خود رسول اللہ ﷺ نیز خلفاء راشدین کی مرضی کے خلاف رواج پزیر ہوئیں ہیں، صحابہ کرام حدیث کو حجت نہیں مانتے تھے، بلکہ کبھی خلاف قرآن تو کبھی خلاف عقل کہہ کر رد کر دیا کرتے تھے۔
- "اطیعوا الرسول" قرآن میں جہاں بھی آیا ہے اس میں اطاعت سے مراد "امام" یا "خلیفہ وقت" کی اطاعت ہے۔
- قرآن پاک میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے قرآن میں حدیث کو "لہو الحدیث" کیا گیا ہے۔
- احادیث ظنی ہیں حدیثوں کی تصحیح و تضعیف بھی ظن تخمین پر مبنی ہے لہذا ظن پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی، کیونکہ ائمہ جرح و تعدیل کے پاس سوائے لوگوں کے بیانات اور اپنے قیاس کے کوئی ایسا معیار نہ تھا جس سے صحیح اور ضعیف روایات کی تعیین قائم کر سکتے۔

اسلم جیراج پوری کے نظریہ حدیث کا جائزہ:

حدیثیں یعنی وہ اقوال واعمال واحوال جو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں اور سلسلہ روایت کتابوں میں مدون کیے گئے ہیں، اُن کے متعلق ابتدا ہی میں یہ بحث شروع ہوئی کہ ان کی حیثیت دینی نہیں ہے بلکہ تاریخی ہے جس کی بنیاد اس بات پر تھی کہ ان کی نسبت آنحضرت ﷺ کی طرف غیر یقینی ہے کیونکہ خبروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک میں تبدیل ہو کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں، اور جتنے بڑے آدمی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں انہی تبدیلی کا امکان زیادہ ہوتا ہے اور نبی

[5] محدث، مدیر: حافظ عبد الرحمن مدنی، اشاعت خاص: فتنہ انکار حدیث، مجلس التحقیق الاسلامی، ستمبر ۲۰۰۲، شمارہ:۹،۸

[6] حافظ صلاح الدین، تاریخ وعقائد منکرین حدیث، ص:۲۵

[7] خادم حسین الٰہی بخش، القرآنیون وشبہاتھم حول السنہ، مکتبہ الصدیق، ۲۰۰۰، ص:۴۵

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

ﷺ دنیا میں سب سے بڑے آدمی تھے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری ہی سے اُمت میں ایسے طبقات پیدا ہوئے جو اپنے اغراض کے لیے حدیثیں بنابنا کر حضور ﷺ کی طرف منسوب کرنے لگے۔ آج حدیث کی جس قدر کتابیں امت کے ہاتھوں میں ہیں ان میں سے کوئی عہد رسالت یازمانہ صحابہ کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ایک مؤطاامام مالک کے سواجو دوسری صدی ہجری کے اواخر کی تالیف ہے، بقیہ جملہ کتب حدیث جن میں صحاح ستہ بھی شامل ہیں تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کی مرتب کی ہوئی ہیں۔ محدثین نے روایات کو دینی تسلیم کر لیااور ان کے اثر سے تمام امت میں ان کی دینی حیثیت مسلم ہوگئی۔

حدیث کی حیثیت تاریخی ہے:

اسلم جیراج پوری کی نظر میں حدیث کی اہمیت تاریخ سے کچھ زیادہ نہیں۔ بالفاظ دیگر کوئی شخص بھی موجودہ مجموعہ احادیث میں سے اگر کوئی حدیث قبول کرنا چاہے تو وہ محض اس کی پسند اور مرضی پر منحصر ہے اور اگر رد کر دیتا ہے تو بھی چنداں مضائقہ نہیں۔[8] مقالات اسلم میں جیراجپوری لکھتے ہیں:

"جب قرآنی حقائق اللہ نے میرے دل پر کھولے اس وقت حدیث کی اصلی حیثیت بالکل واضح ہوگئی کہ وہ دینی تاریخ ہے خود اس کو دین سمجھنا صحیح نہیں، اگر دین ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کریم کی طرح اس کو بھی لکھوا کر امت کو دئے جاتے دین کے لئے قرآن کافی ہے جو کامل کتاب ہے، اور جس میں دین مکمل کر دیا گیا ہے۔"[9]

اسی طرح جیراجپوری لکھتے ہیں:

قرآن کریم پر ہماراایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم جس رسول امین پر اترا۔ اس پر ہماراایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، قرآن کریم جس روح الامین کے توسط سے اتارا گیا اس پر ہماراایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن کریم کو جس معبود نے اتارا اس پر ہماراایمان ہے اور اس پر ہم کو ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، خلاف اس کے نہ حدیث پر ہماراایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے نہ حدیث کے راوی پر ہماراایمان ہے نہ اس پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے نہ حدیث کی سند میں جو رجال ہیں ان پر ہماراایمان ہے نہ ان پر ایمان لانے کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ ایسی غیر ایمانی اور غیر یقینی چیز کو ہم قرآن کی طرح دینی حجت مانیں۔[10]

ایک اور مقام پر جیراجپوری رقم طراز ہوئے:

الفرض حدیث کا صحیح مقام دینی تاریخ کا ہے۔ اس سے تاریخی فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن دین میں حجت کے طور پر وہ نہیں پیش کی جاسکتی۔ اس کو دین بنالینے سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قرآن کریم جو سراسر زندگی ہے حجاب میں آگیا ہے۔ چنانچہ محدثین میں شروح سے لے کر آج تک جو اہم معرکۃ آراء امور زیر بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح وفلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے۔ مثلا حضرت ابو بکر افضل ہیں یا حضرت علی؟ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماء دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے؟ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیے یا نہیں؟ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے؟ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ؟ وغیرہ وغیرہ[11]

احادیث ظنی ہیں:

اسلم جیراج پوری احادیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ ظنی ہیں، وہ بیان کرتے ہیں اللہ تعالی کی اطاعت کے سوا کسی دوسرے کی اطاعت میں گمراہی کا ڈر ہے کیونکہ اکثر لوگ ظنی اور تخمینی باتوں کو دین بنائے ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کی اطاعت رسول اور اس کے بعد خلفاء کے ذریعے ہو گی نہ کہ ظنی روایات کے انبار کے ذریعے۔[12]

[8] عبد الرحمٰن کیلانی، آئینہ پرویزیت، مکتبہ السلام، ۲۰۰۴، ص:۱۲۶

[9] اسلم جیراج پوری، مقالات اسلم، ص:۳۶

[10] اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، س:ن، ص:۱۰۶

[11] اسلم جیراج پوری، علم حدیث، ادارہ طلوع اسلام، س،ن، ص:۴۴

[12] اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، ص:۱۵

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

اس لیے رواۃ کی توثیق یا تضعیف تمام تر تخمین پر مبنی ہے اور صرف حدیثیں ظنی نہیں ہیں بلکہ ان کے جانچنے کا معیار بھی ظنی ہے۔اور یہ وہ بات ہے جس کو خود محدثین نے تسلیم کیا ہے۔[13]

"لھوی الحدیث" سے روایات مراد ہیں:

قرآن پاک میں کتاب اللہ کے سوا کسی حدیث پر ایمان لانے کا حکم نہیں ہے بلکہ ممانعت نکلتی ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ[14]

اور کچھ لوگ کھیل کی باتیں خریدتے ہیں تاکہ بغیر سمجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں اور انہیں ہنسی مذاق بنالیں۔ان کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

آیت میں حدیث کی تین صفتیں بیان کی گئیں ہیں:

I. اس سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

II. اس کی بنیاد علم یقین پر نہیں ہے۔

III. اس سے اللہ کی راہ یعنی دین کو مذاق بناتے ہیں۔

اس لیے جن لوگوں نے اس لفظ کی تعبیر "غنا" یعنی راگ کے ساتھ کی ہے ان کا قول صحیح نہیں؟ کیونکہ راگ سے غرض نشاط و طرب ہوتی ہے نہ کہ گمراہ کرنا یا اللہ کی راہ کو مذاق بنانا، اور نہ اس کا علم یعنی دین سے کوئی تعلق ہے۔یہ صرف قصص و روایات میں جو اُس کے ذیل میں آتے ہیں؟[15]

"اطیعوا الرسول" سے مراد خلیفہ وقت کی اطاعت ہے:

چوتھی دلیل جو بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے، یہ ہے کہ بیسیوں آیتوں میں اللہ نے اطاعت رسول کا حکم دیا ہے۔اگر حدیثیں دینی محبت نہ ہوں تو یہ اطاعت کسی طرح ہو گی؟ دراصل محبت سب سے بڑی غلط فہمی ہے جو حدیثوں کو دین بنانے کا موجب ہوئی ہے۔رسول اللہ ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں۔

- **پیغمبری:** یعنی پیغامات الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔اس حیثیت سے آپ کی اطاعت فرض ہے۔
- **امامت:** یعنی امت کا انتظام۔اس کو قرآن کے مطابق چلانا، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے تدبیر مہمات جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوئی، قیامت تک مستمر ہے، جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہیے۔قرآن میں اطاعت سے مراد امام یا خلیفہ وقت کی اطاعت ہے۔[16]

قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں، وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں ان کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔جب تک محمد ﷺ امت میں موجود تھے ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی اور یہ امت ہمیشہ آپ ہی کی امت رہیگی، کیونکہ آپ کے

---

13 ایضا

14 لقمن ۳۱:۶

15 اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۳۷

16 ایضا، ص:۳۴

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

اوپر ایمان لائی ہے) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی اور اطاعت عربی میں کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو، رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے، ہم اُس کی تعمیل کرنے لگیں۔[17]

حدیث دین اسلام ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی:

منکرین حدیث کا ایک اور شبہ یہ ہے کہ حدیث دین اسلام ہونیکی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے حدیث کے متن اور سند پر تنقید کی گئی ہے۔ اور محدثین کرام نے حدیث کے متون اور سند کے رجال پر جرح کی ہے اور تنقید کی ہے۔ پس جس چیز میں تنقید اور رجال کے آراء داخل ہو جائیں۔ وہ دین کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اسلم جراج پوری لکھتے ہیں:

احادیث پر علمی طور پر جو تنقید کی گئی ہے اس نے حدیث کے تدین کو ختم کر دیا ہے، کیونکہ امور دینیہ تنقید اور لوگوں کی آراء سے مبرا ہوتے ہیں۔[18]

"الحكمة" سے مراد حدیث نہیں:

علمائے کرام حدیث کو حجت شرعی ثابت کرنے کے لیے قرآن سے جو دلائل لیتے ہیں اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ محدثین نے احادیث کی دینی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن سے بھی استدلال کی کوشش کی ہے، مثلا

وانزل الله عليك الكتب والحكمة [19]

ذالك مما أوحى إليك ربك من الحكمة[20]

و اذكرن ما يتلى في بُيُوتِكُنَّ مِنْ أيتِ اللهِ وَ الْحِكمة[21]

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت قرآن میں شامل ہے ورنہ حدیث کی تلاوت کون کرتا ہے قرآن میں ہے کہ ہم نے لقمان کو حکمت دی تو کیا ان کو خاتم النبیین کی طرح احادیث دی گئی تھیں۔

احادیث کی ضرورت کیوں پیش آئی:

قرآن کریم اسلام کی مستقل اور کامل کتاب ہے جس میں اللہ نے اپنے دین کو مکمل کر دیا ہے اور جس کی حفاظت ہمیشہ کے لیے اپنے ذمہ لی ہے۔ یہی کتاب عہد رسالت و خلافت راشدہ میں ملت اسلامیہ کا دستور العمل رہی لیکن جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو وہ حکومت الہیہ جو رسول اللہ نے قائم کی تھی انسانی حکومت میں تبدیل ہو گئی۔ ان نام نہاد خلفاء نے اپنا ذاتی تسلط ملت پر جمایا اور خزانہ اور ملک پر قبضہ کر کے فوج کو اپنے قابو میں کیا اور اس کی قوت سے آزاد مسلمانوں کو اپنی رعایا اور غلام بنالیا اور ان کی دینی قیادت اور راہنمائی جو خلیفہ اسلام کا اولین فریضہ تھی علماء کے ذمہ چھوڑ دی۔ اس وقت سے سیاست اور دین دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ سیاست کا مرکز تو یہی خلفاء رہے اور دین لامرکزی صورت میں علماء کے ہاتھ میں آ گیا۔ ان کے اجتہادات اور استنباطات میں اختلافات کا پڑنا لازمی تھا جن کے فیصلے کے لیے کوئی مرکز نہ تھا اس لیے رسول اللہ کی ذات مرکز بنائی گئی اور ہر مسئلہ اور ہر اجتہاد کے لیے روایت کا سلسلہ نکالا گیا۔ بنی امیہ کے عہد میں چونکہ سادہ عربی زندگی تھی اس وجہ سے روایات کا ذخیرہ زیادہ نہیں ہوا لیکن بنی عباس کے زمانہ میں جب مختلف علوم وفنون کے ترجمے کئے گئے اور متعدد عجمی اقوام سے اختلاط ہوا اور خیالات افکار اور دینی مسائل میں بہت وسعت پیدا ہو گئی۔ اس وقت روایت نے ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر لی اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے یہی پیشہ اختیار کر لیا اور چونکہ روایت کشی کے لیے کسی لیاقت یا

---

[17] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۳۵

[18] حافظ صلاح الدین، تاریخ وعقائد منکرین حدیث، ص:۹۸

[19] النساء۴:۱۱۳

[20] بنی اسرائیل ۱۳:۳۹

[21] الاحزاب ۳۳:۳۴

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

معیار علم کی شرط نہیں تھی اس لیے ہر شخص جس میں ذرا بھی تدین ہوتا اس میں حصہ لے کر دینی عزت اور دنیاوی بزرگی حاصل کرنے لگا اور روایت ایک عام مشغلہ ہوگئی اور ہر شہر میں رواۃ کی تعداد کی کوئی حد نہ رہی۔[22]

علم حدیث پر اسلم جیراجپوری کے اعتراضات کا جائزہ

روایت حدیث پر اعتراض:

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں احادیث بہت کم بیان ہوئیں اسلم جیراج پوری نے روایت حدیث پر نقد کرتے ہوئے اس کی تین وجوہات بیان کی ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہ کرام کی طرف روایات کو منسوب کرنا بعد کے رواۃ کا کارنامہ ہے۔

عہد رسالت اور خلفاء راشدین میں احادیث بیان کرنے کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ کی تاکید تھی کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں روایت کرنے سے بچو اس لیے عہد رسالت میں روایات بہت تھوڑی تھی اور وہ بھی اخباری حیثیت رکھتی تھیں۔ دین کی بنا قرآن کریم اور آنحضرت کے اسوہ حسنہ پر تھی جیسا آپ کو کرتے دیکھتے یا حکم پاتے، اس کے مطابق عمل کرتے۔ رسول اللہ اسی اسلام کے بعد صحابہ چونکہ اپنی محبوب ترین شخصیت سے محروم ہوگئے تھے، اس لیے فرصت کے اوقات میں دوچار جب مل کر بیٹھتے تو آپ کے زمانہ کے تذکرے درمیان لاکر آپ کی یاد تازہ کرتے۔ مگر ان بیانات میں اختلافات ہونے لگے۔ اس وجہ سے خلیفہ اول حضرت ابو بکر نے روایت کی یک قلم ممانعت کردی مگر باوجود اس ممانعت کے بھی روایت کا سلسلہ جاری رہا۔ کیونکہ اس کو جرم نہیں قرار دیا تھا حضرت عمر بھی اپنے زمانہ میں روایت کو روکتے رہے حضرت عثمان کو روایت کی طرف کوئی توجہ نہیں تھی اور وہ اس کو مسترد کردیا کرتے تھے۔ حضرت علی کثرت روایت سے منع فرماتے۔[23]

صحابہ کرام احادیث کو حجت نہیں مانتے تھے:

حضرت عبد اللہ ابن عباس نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت کہ آگ کی چھوئی ہوئی چیز سے وضو ٹوٹ جاتا ہے تسلی نہیں کیا اور فرمایا لہ اس بنیاد پر تو آگ پر گرم کیے ہوئے پانی سے وضو ہی نہیں ہوسکتا۔

حضرت محمود انصاری نے جو صحابی تھے، جب یہ حدیث بیان کی کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہہ یا وہ جہنم کے اوپر حرام ہوگیا تو حضرت ایوب انصاری نے فرمایا کہ واللہ میں نہیں سمجھتا کہ رسول اللہ سلم نے کبھی بھی ایسا کیا ہوئے۔

حضرت ابن عمر نے قلیب بدر والی روایت جب بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو ام المومنین حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمر پر رحم کرے۔ قرآن میں تو ہے "انك لا تسمع الموتى وما انت بمسمع من في القبور"[24]

اسی طرح جب ام المومنین موصوفہ کے سامنے یہ روایت پیش کی گئی کہ مردہ پر اس کے گھر والوں کے توحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو فرمایا کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ قرآن میں ہے کہ "لا تزر وازرة وزر اخرى"

اس قسم کی روایات سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ صحابہ حدیث کو حتمی حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اور کبھی قرآن اور کبھی قیاس کے خلاف دیکھ کر اس کو تسلیم کرنے سے انکار کردیتے تھے۔[25]

صحابہ کرام کو احادیث بیان کرنے کا موقع کم ملا:

[22] اسلم جیراجپوری، ہمارے دینی علوم، ص:۱۰۶

[23] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۲،۳

[24] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۵

[25] ایضا

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

علاوہ بریں صحابہ کرام عملی زندگی میں منہمک تھے اور اعلائے کلمتہ الحق و حروب و فتوحات کی مشغولیت سے اُن کے لیے یہ موقع بھی کم تھا کہ بیٹھ کر روایتیں کرتے۔ وجوہات مذکورہ کے باعث عہد صحابہ میں روایات کا ذخیرہ نہایت قلیل تھا۔ صحابہ میں سب سے زیادہ جس کے نام سے روایتیں بیان کی گئی ہیں، وہ حضرت ابو ھریرہ ہیں۔ ابن مخلد کا بیان ہے کہ ان کی مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ حالانکہ وہ عام خیبر میں اسلام لائے اور صرف تین سال رسول اللہ ﷺ کی حضوری میں شرفیابی کا موقع پایا، پھر یہ کیونکر یقین کیا جائے کہ ان کی روایتیں اس قدر ہو سکتی ہیں جن میں سے بہت سی ایسی ہیں کہ ان کے اوپر عقل و علم کی روسے گرفت کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے۔ اس لیے ہمارا ضمیر قبول نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی روایتیں انہوں نے بیان کی ہونگی اس لیے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ ان کے ناموں سے جو بے شمار روایتیں منسوب کی گئی ہیں وہ زمانہ مابعد کے رواۃ کا کارنامہ ہیں، جبکہ حدیثوں نے فن کی صورت اختیار کر لی اور ہر روایت کے لیے سلسلہ سند کی ضرورت پڑی جو بلا کسی صحابی کے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی نہیں ہو سکتا تھا۔[26]

کتابت حدیث پر اعتراض:

اسلم جیر اج پوری کتابت حدیث پر اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرمادیا تھا کہ مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہو، تو اس کو مٹادے۔" یہ روایت صحیح مسلم میں ہے، اس وجہ سے محدثین اس کو موضوع تو نہیں کہہ سکے، مگر چونکہ اس سے اُن کی ساری بنیاد منہدم ہوئی جاتی تھی اس لیے اسکی توجیہ یہ کی کہ مقصد اس مانعت سے ہی تھا کہ قرآن مجید کے ساتھ کوئی دوسری چیز مخلوط نہ ہو جائے۔ لہذا جب التباس کا خوف نہ ہو تو کتابت جائز ہے۔ اس طرح پر رسول اللہ اسلام کے منع کتابت حدیث کے واضح اور صریح حکم کو مٹادیا۔ حالانکہ آپ نے اس کی کوئی علت بیان نہیں فرمائی تھی اور بلا کسی قید کے مطلقا ممانعت کی تھی۔ اگر حضور اکرم ل ﷺ کا یہ مقصد ہوتا کہ قرآن و حدیث مخلوط نہ ہونے پائیں، تو فرماسکتے تھے کہ دونوں کو الگ الگ لکھو۔ اس لیے محدثین کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اصلی وجہ اس کی وہ ہے جو صحابہ کرام نے بھی سمجھی یعنی یہ کہ گذشتہ قومیں اپنے انبیا کی روایات لکھنے کی بدولت گمراہ ہوئیں۔ چناچہ جیر اجپوری لکھتے ہیں:

"ان ابتدائی تالیفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتاوے سب ملے جلے تھے۔ بعد کے لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو الگ مدون کرنا شروع کیا۔ اس قسم کی تالیفیں مسند کہی جاتی ہیں۔ سب سے پہلی مسند عبد اللہ بن موسیٰ نے تیسری صدی ہجری کے آغاز میں لکھی پھر مسند بصری، احمد بن موسی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے ان کے بعد کے طبقہ نے بھی ان ہی کی پیروی کی۔ مثلا امام حمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہ، چوتھے طبقہ میں امام بخاری متوفٰی ۲۵۶ھ نے صرف صحیح حدیثوں کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ ان کے بعد ان کے شاگرد امام مسلم نیشاپوری متوفی ۲۶۱ھ نے بھی انہی کی پیروی کی۔ یہ دونوں کتاب صحیحین کہی جاتی ہیں، اس زمانہ سے کتابت حدیث محدثین کا عام مشغلہ ہو گیا او مختلف نوعیتوں سے اس کی اس قدر کتابیں لکھی گئیں، جن کا شمار مشکل ہے۔

یہاں غور کے قابل یہ امر ہے کہ حدیثوں کی اگر دینی حیثیت ہوتی تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اس شدت کے ساتھ اس کی کتابت کو نہ روکتے بلکہ اس کے بر خلاف اس کی حفاظت کی کوشش کرتے۔"[27]

علم اسماء رجال پر اعتراض:

اسلم جیر اجپوری مسلمانوں کے اصول درایت کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں مسلمانوں کا پانچ لاکھ افراد کے حالات زندگی کو جمع کرنا محض ایک دماغی تعزیر ہے۔ حدیثیں اسناد کے ساتھ جمع کی گئی تھیں، یعنی ان راویوں کے ناموں کے ساتھ جن کے ذریعہ سے پہنچی تھیں۔ اس کے بعد سے تنقید کا کام شروع ہوا اور صحیح اور غلط کی چھان بین ہونے لگی۔ اس تنقید میں ائمہ حدیث نے دو چیزوں کو سامنے رکھا۔ ایک متین حدیث کو، دوسرا روات کو۔

---

26 اسلم جیر اجپوری، علم حدیث، ص:۶

27 اسلم جیر اجپوری، علم حدیث، ص:۱۴

- متن کی شناخت کے لیے انہوں نے کچھ اصول مقرر کیے لیکن ان اصولوں سے صرف تھوڑی سی غلط اور موضوع حدیثیں پکڑی جا سکیں، کیونکہ جو لوگ حدیثیں تراشتے تھے، وہ اس کے ہر پہلو پر نظر ڈال لیتے تھے، تاکہ کہیں سے گرفت نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں محدثانہ تاویلات کا دروازہ ایسا کھلا ہوا تھا کہ جہاں کوئی روایت عقل یا قرآن وغیرہ کے خلاف معلوم ہوتی، فوراً مطابقت پیدا کر لی جاتی۔ چنانچہ صحیح بخاری کا صرف ایک باب کتاب الانبیاء لے لیجیے۔ اس میں ہے کہ حضرت سلیمان نے اس امید میں کہ ان کی ہر ہر بیوی ایک ایک مجاہد فرزند جنے گی، ایک رات میں اپنی نوے بیویوں پر گشت لگایا۔ اسی میں ہے کہ حضرت موسی نے ملک الموت کو ایسا تھپڑ مارا کہ وہ واپس لوٹ گئے۔ اس میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے (جن کو قرآن میں صدیق نبی کہا گیا ہے)، تین جھوٹ بولے۔ مگر محدثانہ تاویلات کے یہ کرشمے ہیں کہ باوجود ان سب کے بھی بخاری کی کوئی روایت غلط نہیں ہے اور وہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، لہذا یہ اصول جو غلط روایتوں کو پہچانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً بیکار ثابت ہوئے۔
- اس لیے ان نقادوں نے دوسری چیز یعنی رواۃ کی جانچ پر زیادہ مدار رکھا لیکن ظاہر ہے کہ حضرات نبی تو تھے نہیں کہ سوڈیڑھ سو سال سے ہزار ہا وضاعین اور کذابین جو پیدا ہوتے چلے آرہے تھے اور جن میں سے اکثر جمہور میں مقبول اور محرم بھی تھے ان کو الہام الٰہی سے شناخت کر لیتے۔ ان کے پاس ان کے پہچانے کا جو کچھ ذریعہ تھا وہ بھی روایات ہی کا تھا یعنی ہر ایک راوی کے صدق و کذب کی بنیاد انہوں نے ان روایات پر رکھی جو اس کے متعلق لوگوں سے پہنچی تھیں۔[28]

"لیکن محدثین کو چونکہ حدیثوں کو صحیح یا غلط قرار دینے کے لیے ایک معیار کی ضرورت تھی اس وجہ سے انہوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اس سلسلہ کو بڑھا کر ایک مستقل فن بنالیا، اور آج تو وہ بڑے فخر کے ساتھ ڈاکٹر اسپرنگر کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ مسلمان اس خصوصیت میں ممتاز ہیں کہ انہوں نے اپنے پانچ لاکھ علماء کے حالات محفوظ رکھے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنہوں نے اعلائے کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر میں کارنامے چھوڑے ہیں۔ بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا، یہ روایت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا، ان کی کنیت کیا تھی ان کے کون کون اُستاد تھے اور کون کون شاگرد، ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ کوئی مفید یا قابل فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لیے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب سے ملی ہے۔[29]

خود فن رجال ظنی ہے اس لیے اس کے اصول کی مراعات سے بھی روایات کی صحت کی ضمانت نہیں ہو سکتی جس کے چند وجوہ یہ ہیں:

- اس فن میں رجال کے صدق و کذب کا مدار ان کے ہم عصروں کی شہادتوں پر رکھا گیا ہے حالانکہ یہ ایسی باطنی صفتیں ہیں جن کے اوپر سوائے ظن اور تخمین کے یقینی شہادت ہو ہی نہیں سکتی۔
- یہ ہم عصروں کی شہادتیں بھی ہم خیالی استادی شاگردی اور دیگر عواطف و میلانات پر مبنی ہیں چنانچہ سنی شیعہ راویوں کو اور شیعہ سنی راویوں کو من حیث الجماعت غیر معتبر سمجھتے ہیں۔

علم الجرح والتعدیل پر اعتراض:

اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:

الغرض جرح و تعدیل کا فن سرتاسر قیاسی ہے اور اس قیاس میں بھی جذبات اور عواطف کے علاوہ تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ تذکرۃ الموضوعات میں ہے کہ:۔

امام احمد بن حنبل، ابن مہدی اور ابن مبارک تینوں کا بیان ہے کہ ہم حلال اور حرام کی روایتوں کی جانچ میں سختی کرتے ہیں اور فضائل وغیرہ کی روایتوں میں نرمی۔[30]

اصول حدیث پر اعتراض:

---

[28] ایضاص:۲۲

[29] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۲۵

[30] ایضا، ص:۲۵

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

اصول حدیث سے یہاں میری مراد اس کی اصطلاحات نہیں ہیں بلکہ وہ قواعد ہیں جن کو محدثین نے روایت میں مرعی رکھا۔ یہ اصول تقریبا سب کے سب ناقص اور نظری حیثیت سے نہایت کمزور ہیں۔ اس موقع پر ان میں سے صرف دو اصول کو لیتا ہوں جن سے حدیثوں کی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔

پہلا اصول روایت بالمعنی کا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے روایتیں کی گئی ہیں وہ بلفظ نہیں ہیں بلکہ بامعنی ہیں اور بلفظہ ہو بھی کیسے سکتی تھیں کیونکہ حضور کی مجلس میں جو صحابہ موجود ہوتے تھے، وہ نہ آپ کی باتیں لکھا کرتے تھے، نہ یاد کر کے سنایا کرتے تھے اور ان کو بیان کرنے کا موقع بھی ایک مدت کے بعد پیش آیا۔ اس وجہ سے ان کے لیے اتنے الفاظ کو نقل کرنا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے تھے متعذر تھا۔ لہذا وہ اپنے الفاظ میں بیان کرنے لگے اور اس کو محدثین نے اصولاً جائز قرار دے دیا، اور روایت بالمعنی رائج ہو گئی۔ بعد میں بعینہ الفاظ محفوظ ثابت ہو جائیں تو یہ تفاقی امر ہے۔ روایات کے بالمعنی ہونے سے حدیثوں کی منزلت میں بہت فرق آ گیا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان کی نسبت صرف معنوی رہ گئی اور صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ رواۃ کے الفاظ کہاں تک آپ کے بیان کے مدعا کے مطابق ہیں، اس لیے کہ کبھی کبھی صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورے کلام کا مفہوم بدل جاتا ہے اور یہ امر تو بالکل واضح ہے کہ ایسی صورت میں الفاظ حدیث سے کسی خاص مقصد پر استدلال نہایت بے بنیاد ہے کیونکہ معلوم نہیں کہ اصلی لفظ کیا تھا؟

دوسرا اصول خبر منفرد کی مقبولیت کا ہے یعنی محدثین نے اس روایت کو جس کا راوی کسی درجہ میں صرف ایک ہی ہو لیکن ان کے معیار کے مطابق ثقہ ہو، مقبول قرار دیا۔ علما محققین نے اسی وقت اس کی مخالفت کی۔ ابراہیم بن اسمعیل نے کہا کہ روایت بمنزلہ شہادت کے ہے۔ اس لیے جب تک ہر درجہ میں کم سے کم دو راوی نہ ہوں، قبول نہیں کی جاسکتی۔ معتزلہ اور خاص کر ابو علی جبائی نے بھی نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا، مگر محدثین نے کوئی التفات نہیں کیا، کیونکہ اس سے احادیث کے ایک بڑے حصہ سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑتا حالانکہ قرآن میں معمولی لین دین جو کہ دنیاوی ہے دو گواہ بنانے کا حکم ہے تو دین کے معاملے میں کیوں نہیں ہو گا۔ خود روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین گواہ طلب کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر کے پاس ایک عورت آئی جو اپنے پوتے کے ترکہ میں سے حصہ مانگتی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تیرا حصہ نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو سدس دلوایا ہے۔ فرمایا کہ کوئی تمہارے اس قول پر شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ نے کہا کہ میں شہادت دیتا ہوں۔ اُس وقت اس کو ایک سدس دلوا دیا۔ اسی طرح حضرت عمرہ کے دروازہ پر ابو موسی نے آواز دی۔ جب جواب نہ ملا تو واپس چلے۔۔۔۔۔۔۔۔ ساتھ چلے، چنانچہ جب ایک صحابی نے جا کر شہادت دے دی، تب حضرت عمر نے ان کو چھوڑا۔ مگر عہد صحابہ میں عینی شاہد کا ملنا ممکن تھا، اس لیے اس وقت یہ طرز عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے کہ اربوں ہو جائے، ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے۔ اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو عدل شاہد پیش کرے، جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے۔ پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کی سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصول عدالت اور قانون شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے پاس جس قدر ذخیرہ روایات کا ہے، اس میں ایک روایت بھی ایسی ہے جو اس طرح شہادتوں سے ثابت کی گئی ہو یا کی جاسکتی ہو؟ اس لیے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔[31]

حدیث کے دلائل پر اعتراض:

وَ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُۗ-وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْاۚ[32]

[31] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۳۰

[32] الحشر۵۹:۷

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY
Vol.4 No.2 2026
ISSN P : 3006-3329
ISSN E : 3006-3337

یہ آیت مال فئے کی تقسیم کے بارے میں ہے۔ حدیث سے اُس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہاں "آتا" کے لفظ کو جو نھی کے بالمقابل واقع ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے "قال" کے معنی میں سمجھ لیا، حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سیکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ اس کے معنے دینے ہی کے ہیں۔ لہذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ حدیثیں اقوال ہیں، ان کے لیے دینے کا لفظ نہیں کہا جاسکتا۔ رسول اللہ نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔[33]

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی[34]

بعض حضرات نے دلیل یہ دی ہے کہ سورہ النجم میں ہے: رسول اپنے نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ وحی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے جو نکلتا تھا وہ سب وحی تھا۔ لیکن یہ استدلال حقیقت فہمی سے بہت دور ہے، کیونکہ یہاں ذکر ہے اس کلام کا جو بذریعہ وحی کے اترتا تھا اور جس سے کفار کو انکار تھا اور وہ صرف قرآن ہے۔ آنحضرت ﷺ خانگی امور میں ازواج مطہرات سے یا عام معاملات میں دوسرے لوگوں سے رات دن گفتگو فرماتے تھے۔ اُس کے وحی ہونے کا نہ کوئی دعوی تھا، نہ اس کے متعلق کوئی بحث تھی، مخالفت صرف قرآن کی تھی اور وہی بذریعہ وحی کے نازل کیا گیا۔

بعض لوگوں نے وحی کی دو قسمیں کر ڈالی ہیں۔ متلو اور غیر متلو یا جلی اور خفی ایک کو قرآن ایک کو حدیث کہہ دیا لیکن یہ ان کی محض خیالی اصطلاح ہے، جس کو قرآن سے کوئی سروکار نہیں۔ حدیثیں بھی اگر وحی تھیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو قرآن کی طرح لکھایا کیوں نہیں؟

ایک دلیل ان کی یہ ہے کہ قرآن میں نماز کے اوقات، تعداد، رکعات، نصاب زکوۃ اور روزہ اور رجم کی تفصیلات کہاں ہیں؟ لہذا اگر حدیثیں دین نہ مانی جائیں تو یہ باتیں ہم کو کیونکر معلوم ہو گی؟

بیشک قرآن کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا، مگر اس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ ﷺ کے سپرد کردی اور فرمایا" لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة"تمہارے لیے رسول کی ذات میں اچھا نمونہ ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے احکام کے عمل کرکے دکھلا دیا اور ان کی تفصیلات اُمت کو سکھلا دی۔ وہ عملی نمونے سلسلہ بسلسہ متواتر چلے آرہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں۔ ان کے لیے غیر یقینی روایات کی کیا ضرورت ہے، ان کی وجہ سے تو اس تواتر میں بھی کہیں کہیں اختلاف پڑگئے ہیں، جو مٹائے نہیں مٹتے۔[35]

خلاصہ کلام:

اسلم جیراجپوری جو کہ ایک معروف منکر حدیث کے نام سے جانا جاتا ہے، اس تحقیق میں جیراج پوری کے افکار کو ان کی اصل کتب کی روشنی میں نقل کرتے ہوئے حدیث کے بارے میں ان کے بنیادی نظریات کو واضح کیا گیا ہے۔ خصوصاً حدیث کی حجیت، تدوینِ حدیث، اور قرآن و حدیث کے باہمی تعلق کے حوالے سے ان کے موقف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مزید برآں، علماء کے قائم کردہ دلائل جو حدیث کی شرعی حیثیت کو ثابت کرتے ہیں، ان پر جیراج پوری کے اعتراضات کو بھی اصل مآخذ سے اخذ کرکے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق ان اعتراضات کی وجوہات اور پس منظر کو بھی واضح کرتی ہے تاکہ قاری کو ایک متوازن اور مستند فہم حاصل ہو سکے۔ آخر میں یہ مطالعہ اس نتیجے کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ جیراج پوری کے نظریات روایتی مؤقف سے مختلف ہونے کے باوجود علمی بحث کا اہم حصہ ہیں، جنہیں سمجھنے کے لیے ان کے اصل مصادر کا براہِ راست مطالعہ ضروری ہے۔

مصادر و مراجع

- سعید مجتبٰی سعیدی، پروفیسر، منکرین حدیث کے شبہات اور ان کا رد، دار الابلاغ، ۲۰۰۹ء
- حافظ صلاح الدین، تاریخ وعقائد منکرین حدیث، علوم اسلامیہ عربی گومل یونیورسٹی: ڈیرہ اسماعیل خان، ۱۹۹۶ء
- ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر، مولانا اسلم جیراج پوری حیات وخدمات، شعبہ عربی اے ایم یو علی گڑھ، ۲۰۰۱ء

---

[33] اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ص:۳۰

[34] النجم ۵۳:۳

[35] ایضا، ص:۳۵

THE STUDY OF RELIGION AND HISTORY

ISSN P : 3006-3329

ISSN E : 3006-3337

Vol.4 No.2 2026

- خادم حسین الٰہی بخش، القرآنیون وشبہاتھم حول السنہ، مکتبہ الصدیق، ۲۰۰۰ء
- اسلم جیراج پوری، مقالات اسلم، امداد صابری چوڑیوالاں، دہلی، س:ن
- حدث، مدیر: حافظ عبد الرحمن مدنی، اشاعت خاص: فتنہ انکار حدیث، مجلس التحقیق الاسلامی، ستمبر ۲۰۰۲، شمارہ: ۸-۹
- محمد دین قاسمی، پروفیسر، ڈاکٹر، تفسیر مطالب القرآن کا علمی و تحقیقی جائزہ، ادارہ معارف اسلامی، ۲۰۰۹ء
- عبد الرحمن کیلانی، آئینہ پرویزیت، مکتبہ السلام، ۲۰۰۴ء
- اسلم جیراج پوری، ہمارے دینی علوم، مکتبہ جامعہ نئ دہلی، س:ن
- اسلم جیراجپوری، علم حدیث، ادارہ طلوع اسلام، س:ن